

علامہ اقبال سے متعلق خصوصی انٹرویو (۲)

* ایم۔ ایس ناز

مولانا غلام مرشد

س :- مولانا - موجودہ دور میں آپ کی ذات گرامی تاریکیوں میں روشنی کے صدائق ہے۔ اس لئے ہم آپ سے علامہ اقبال سے آپ کی ملاقاتوں کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، یہ ملاقاتیں کب شروع ہوئیں اور کب تک جاری رہیں؟

ج :- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ سے سیری اولین ملاقات ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکوں پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے گئے اور شیخ کویت نے تمام عرب ممالک کو اپنا ہم خیال بناتے ہوئے، انگریزوں کی فریب کاریوں میں آکر ترکی کی وسیع ترین مملکت کا خاتمہ کر دیا، تو اس سرزمین میں شیخ سنوسی علیہ رحمۃ ایک ایسی ہستی تھے، جنہوں نے بار بار عرب ریاستوں کو ان ہولناک نتائج سے آگے کیا، مگر ان پر انگریزوں کی حمایت کا جنون کچھ اس طرح سے سوار تھا کہ حضرت شیخ سنوسی علیہ رحمۃ کی مجاہدانہ اور مصلحانہ تحریک ناکام ہوگئی، جس کو اس وقت حضرت علامہ نے ایک شعر میں یوں بیان کیا :-

کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب (۱) کا حجازی ہے ہر دل کا حجازی بن لہ سکا

(۱) مولانا غلام مرشد کے بقول اس شعر کا مصرعہ ثانی ابتدا میں یوں تھا کہ

تو چڑھے کا تو حجازی ہے، ہر دل کا حجازی بن لہ سکا

شاید چڑھے کے لفظ سے زیادہ تلفظ نمایاں ہوتی ہو، اس لئے ہم نے اس کی جگہ نام و نسب، کی ترمیم کردی گئی، مولانا نے اس مصرعہ ثانی کو ابتدائی صورت ہی میں پڑھا۔

اس بے پناہ صدمے سے متاثر ہو کر متحدہ ہندوستان میں تحریک خلافت شروع ہوئی، جس کے بہت بڑے سرپرست حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر سولانا عبدالقادر قصوری تھے، جو بے حد مخلص تھے۔ صدر محترم کے اس خلوص کی بدولت خاکسار غلام مرشد کو تحریک خلافت کی پنجاب ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا شرف حاصل ہوا اور جب ڈاکٹر کچلو گرقنار ہوئے تو خاکسار کو ان کی جگہ نائب صدر بنایا گیا۔ تحریک خلافت کی مقبولیت بڑے شہروں اور قصبوں کے علاوہ دیہاتوں کے گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی تو متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ مناصب رکھنے والے مسلمان اور امیدوار انگریز کے آلہ کار بن کر اس مقبول ترین تحریک کو ناکام بنانے کے لئے میدان میں آگئے اور ترکین کے خلاف مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا، یہاں تک کہ سرکاری اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ (Civil & Military Gazette) میں ان کے بیانات بکثرت شائع ہونے لگے۔ ان خطاب یافتہ بزرگوں کا بڑا حربہ یہ تھا کہ خلیفہ ہونے کے لئے قریشی ہونا ضروری ہے اور چونکہ ترک قریشی نہیں ہیں، اس لئے وہ خلافت کے اہل نہیں ہیں۔ ان خطاب یافتہ یا امیدواران خطابات نے اس حدیث کو ڈھال بنایا ”الائمة من قریش“۔ اس حدیث کو اخبار ’سول اینڈ ملٹری گزٹ‘ نے اپنے ادارہ (Editorial) کا عنوان بنایا، جس کو پڑھ کر حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب خلافت کمیٹی کے معزز صدر سے ارشاد فرمایا کہ اس کا سبک جواب کسی کتاب و سنت کے جاننے والے سے لکھوا کر اخبار کو بھیجا جائے اور اس ضمن میں ایک جلسہ عام بھی منعقد کیا جائے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ علامہ اقبال اور سولانا عبدالقادر قصوری نے یہ ذمہ داری سہرے سیرد کی۔

س:- اس وقت تک آپ کی حضرت علامہ سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی

تھی؟

ج:۔ جی نہیں۔ ابھی مجھے ان سے براہ راست ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا تھا، وہسے حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ مجھے ایک دوست شیخ کلب دین کے توسل سے خوب جانتے تھے، جن کے مکان میں وہ کرایہ دار کی حیثیت سے رہ چکے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے ایک اور دوست شیخ احمد وکیل بھی میرے درس میں باقاعدگی سے آتے تھے اور ہوں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ مجھے بالواسطہ طور پر اچھی طرح سے جانتے تھے۔

س:۔ آپ فرمائیے تھے کہ پنجاب خلافت کمیٹی کے صدر نے حضرت علامہ کے اشارے پر یہ ذمہ داری آپ کو تفویض کی کہ آپ، 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں شائع ہونے والے بیانات و اعتراضات اور ادارہ میں اٹھائے گئے نکات کا جواب لکھیں؟

ج:۔ جی ہاں۔ اس پر خاکسار نے ان سے ایک ہفتہ کی سہلت مانگی اور عرض کیا کہ آپ جلسہ کے انعقاد کی تیاری جاری رکھیں اور ادھر مجھے کم از کم سات روز دئے جائیں کہ میں کوئی سسکت اور سیر حاصل جواب لکھ سکوں اور پھر اس جواب کہ مجوزہ جلسہ عام میں بھی پڑھ کر سناؤں۔ چنانچہ انہوں نے میری بات مان لی۔ ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد مقررہ وقت پر طے شدہ پروگرام کے عین مطابق ایک عظیم جلسہ باغ بیرون لوہاری دروازہ متعلقہ ہوا اور شاہ عالمی دروازہ سے بھائی دروازہ تک لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ اس جلسہ میں شیخ پر دیگر اخبار نویسوں سے ہمارے مخالف و سہراہ اخبار 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' کے ایڈیٹر بھی معہ اپنے رپورٹر کے موجود تھے۔ جلسہ کا انتظام سولانا غلام محی الدین قصوری کے ذمے تھا، جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بہ احسن طریق نبھایا اور یہ جلسہ ایک تاریخی اجلاس کی حیثیت اختیار کر گیا۔ شروع کے مقرروں میں مجھے بلایا گیا اور میں نے حدیث:

’الائمة من قريش‘ کے موضوع پر اظہار خیال کیا، جس کا خلاصہ ہے کہ یہ حدیث درایتاً صحیح ہے نہ روایتاً۔ درایتاً اس لئے کہ یہ قرآن کی آیت استخلاف کے خلاف ہے، چوبیس آیات اس کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔

وعد الله الذين آمنوا منكم و عملوا الصلحت ليستخلفنهم في الأرض
كما استخلف الذين من قبلهم و ليمكنن لهم دينهم الذي ارتضى
لهم و ليبدلنهم من بعد خوفهم اننا يعبدونني لا يشركون
بي شيئا و من كفر بعد ذلك فاولئك هم الفاسقون . (۱)

(ترجمہ) تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کو اس اتباع کی برکت سے حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی اور جس دین کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے، اس کو ان کے لئے قوت دے گا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو تبدیل بہ امن کر دے گا، بشرطیکہ سیری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور اس کے بعد جو ناشکری کرے گا تو یہ لوگ بے حکم ہیں۔

اس آیت میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپہ کے مخلص غلاموں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس میں قریش و غیر قریش اور عربی و عجمی کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی گئی۔ میں نے جلسہ عام میں کہا کہ پیغمبر کو بھی جب یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ خدا کے احکامات میں تبدیلی کرے، تو پھر کسی کو یہ جرأت نہیں ہولی چاہئے کہ وہ ایسی احادیث کو بیان کرے، جو درایتاً صحیح نہ ہوں۔ اور پھر

میں نے یہ بھی کہا کہ مذکورہ حدیث روایتاً اس لئے بھی غلط ہے کہ اس کی جو سندات خاکسار کی نظر سے گزری ہیں، وہ اور ان کے راوی اس معیار پر پورا نہیں اترتے۔ جو حضرت امام بخاری علیہ رحمۃ نے مقرر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نہ صرف امام بخاری رحمہ نے، بلکہ امام مسلم رحمہ تک نے اس حدیث کو درج نہیں کیا۔

دلائل و براہین کی کثرت کے باعث سیری تقریر کا کافی طویل ہوگئی، تاآنکہ میں نے سولانا قصوری صاحب کے بار بار اصرار پر اپنا بیان ختم کر دیا۔

دوسرے روز 'سول اینڈ مائٹری گزٹ' سمیت تمام اخبارات میں اس جلسہ کی کارروائی شائع ہوئی، تو یہ بات میرے لئے بھی نہایت حیران کن تھی کہ سیری مکمل تقریر شامل اشاعت تھی، حضرت علامہ نے اسے پڑھا، تو اپنے دوست محمد دین تاثیر کو میرے ہاں بھیجا۔ انہوں نے آکر مجھے پیغام دیا کہ علامہ یاد فرما رہے ہیں۔ میرے لئے یہ سیرت کا مقام تھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت وہ اپنی آرام کرسی پر تشریف فرما تھے۔ ایک والہالہ جوش اور جذبہ کے ساتھ اٹھے اور دیوالہ وار مجھے گلے لگا لیا۔ پھر سیری پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا: میں تمہیں سولوی کی بجائے آج سے ہدو سولوی کا لقب دیتا ہوں اور وہ مجھے رحلت تک 'ہدو سولوی' ہی کہہ کر یاد کرتے رہے۔

کیا اس وقت علامہ سیکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے؟ جہاں تک سیری یاد داشت کام کرتی ہے، اس وقت آپ میرے قریب ہی شیخ کلاب دین کے مکان واقع بھائی دروازہ میں رہتے تھے اور شاید سیکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

س:- حضرت علامہ سے یہ آپ کی پہلی بالمشافہ ملاقات تھی ؟

ج:- ہاں۔ یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، جس کی تھوڑی بہت تفصیل مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس ملاقات میں حضرت علامہ نے اس تقریر پر کافی دیر تک میرے ساتھ گفتگو کی اور فرمایا کہ تمہارا یہ کہنا بجا ہے کہ امام ابو الحسن اشعری سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی تک جن متکلمین حضرات نے اس حدیث کو درج کیا ہے، ان کے الدراج کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اخبار ’سول اینڈ ملٹری گزٹ‘ کو چاہئے کہ ان لوگوں کو زیادہ سے زیادہ انعام کی پیشکش کر کے یہ اعلان کرے کہ محمود غزنوی کی سلطنت میں کوئی ایسا مرد قلندر تھا، جس نے یہ سوال اٹھایا کہ خلافت یا حکومت کے حقدار صرف اور صرف قریش ہیں ؟ شاہ ولی اللہ کے دور میں مغلوں کی حکومت تھی، لیکن انہوں نے بھی ایسی کوئی تحریک شروع نہ کی کہ خلافت کا حقدار کون ہے۔؟ میں نے حضرت علامہ سے عرض کیا کہ ان متکلمین حضرات کی جو کتاب بھی آپ اٹھائیں گے، ان میں سے ہر ایک میں باقاعدہ ایک فصل ملے گی، ایک باب اس عنوان کے تحت ملے گا کہ : ’الائمة من قریش‘۔ یہ بات خود ان کے عمل کے خلاف تھی۔ میں آج بھی یہ بات بیالگ دہل کہوں گا کہ جو لوگ ایک عقیدے کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتے، انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس قسم کا وعظ کریں۔

حضرت علامہ نے اس موقع پر مجھ سے ایک بڑا دلچسپ اور فکر انگیز سوال کیا کہ لوگ تو یہ کہیں گے کہ تم بڑے عالم ہو یا وہ بڑے عالم تھے۔؟ میں نے انکسارانہ لہجے میں عرض کیا : میں تو کوئی عالم نہیں ہوں، فقط ایک طالب علم ہوں، لیکن بہر حال جن لوگوں نے

متکلمین ہونے کی حیثیت سے (خلافت قریش کے بارے میں) کتابوں میں لکھا ہے، خواہ وہ شرح عقائد ہو، یا شاہ ولی اللہ کی حجة اللہ البالغہ، خواہ مید شریف جرجانی کی شرح سواقف ہو یا علامہ تقفازانی کی شرح مقاصد، ان میں سے بعض لوگ وہ ہیں، جو تاتاریوں کے دور حکومت میں پیدا ہوئے اور ان ہی کے عہد میں انہوں نے زندگی گزاری، ان کے رحم و کرم سے ان لوگوں کو حدیثیں اور دیگر کتابیں لکھنے کا موقع ملا، حیرت کی بات ہے کہ وہ لوگوں کو درس تو دیتے تھے (قریش کا) اور خود غیر قریش حکومت کے ماتحت زندگی گزارتے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ جب امام ابو الحسن اشعری سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی تک کسی نے اس حدیث کی آڑ لے کر تحریک شروع نہ کی تو موجودہ دور میں بھی ان خطاب یافتہ بزرگوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس پر حاشیہ آرائی کریں اور اسلامی اتحاد کو نقصان پہنچائیں۔

کافی دیر تک حضرت علامہ سے اس موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور وہ خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے۔ آخر میں فرمایا کہ تمہیں اس تقریر سے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ حضرت علامہ کا یہ اندیشہ حرف بہ حرف درست تھا، کیونکہ میں جس دارالعلوم میں صدر تھا، اس کا ایک ایک رکن خلافت کبھی کے خلاف تھا۔

س :- آپ کا اشارہ کس دارالعلوم کی طرف ہے ؟

ج :- دارالعلوم نعمانیہ ہند، جہاں سے ۱۹۲۶ء میں استعفیٰ دے کر چلا آیا۔ اس استعفیٰ کی وجہ دراصل اظہار وجوہ کا وہ نوٹس تھا، جو عمر علی چشتی اور تاج دین ایڈووکیٹ نے دارالعلوم کی طرف سے سرے لام جاری کیا۔ ان ہر دو اصحاب نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کو اس طرح کی

تقریر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ مضمون اپنے فارغ وقت میں لکھا ہے اور پھر اس پر تقریر کی ہے، لیکن 'دارالعلوم' کے فرائض سے میں نے ہرگز انحصار نہیں ہوتا، لیکن وہ لوگ مجھے ملازمت سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، لہذا میں نے استعفا دے دیا اور فارغ الذہن ہو کر اونچی مسجد الدرون بھائی گیٹ چلا آیا اور یہاں درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ علامہ اقبال کو جب اس صورت حال کا علم ہوا، تو انہوں نے فرمایا: اس میں فکر کی کوئی بات نہیں، حق بات کہنے اور لکھنے کی ہاداش میں انسان کو ایسی کئی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ دارالعلوم کی ملازمت سے فراغت کے بعد مجھے علامہ سے ملاقاتوں کے لئے زیادہ وقت سہرا آنے لگا اور اب میرا زیادہ وقت ان کی صحبتوں میں گزرتا تھا۔

س :- حضرت علامہ سے آپ کی آخری ملاقات کب ہوئی؟

ج :- وصال سے ایک ہفتہ پہلے تک حضرت علامہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخری ملاقات، ان کی رحلت سے چند یوم پہلے ہوئی، جب انہوں نے مجھے م۔ ش کے توسل سے پیغام بھیجا کہ ملاقات کے لئے آؤ۔ اس وقت وہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ میں حاضر ہوا، علالت کے باوجود تپاک سے ملے، م۔ ش سمیت سب لوگوں کو کمرے سے نکل جانے کی استدعا کی اور آخر میں اپنے خاص خادم علی بخش کو بھی باہر چلے جانے کو کہا۔ پھر مجھے بستر پر پاس بٹھالیا۔ سرہانے پڑا ہوا قرآن شریف اٹھایا اور سورۃ 'النجیم' کے اوراق کھول کر فرمائے لگے کہ میں اس سورۃ کی پہلی تین آیات کی تفسیر کے متعلق بیشتر علماء کرام سے استفسار کر چکا ہوں، مگر مجھے تسلی و تشفی نہیں ہوئی۔ بالآخر آپ کو زحمت دی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ان کی تفسیروں سے

آپ کو تسلی و تشریح ہو ہی نہیں سکتی۔ تب میں نے پہلے یہ تین آیات پڑھیں : والنجم اذا هوى . ما ضل صاحبکم وما غوى . وما ينطق عن الهوى .

میں نے عرض کیا کہ نجم کے معنی جہاں کوکب، ستارے، ہودے بیل یا شجر کے ہیں، وہاں اس کے معنی حصہ کے بھی ہیں۔ 'ہوی، کے معنی اگر گرنے کے ہیں تو اترنے کے بھی ہیں۔ حضرت علامہ نے فرمایا : ٹھیک ہے۔ تب میں نے عرض کیا کہ اس آیت کی تشریح یوں ہے : گواہ ہے ہر حصہ قرآن کا، جب اترتا ہے وہ، یعنی گواہی دیتا ہے تیری صداقت پر۔ اب سوال یہ ہے کہ کس بات کی شہادت دیتا ہے ؟ 'ما ضل صاحبکم، صاحب سے مراد یہاں رسول پاک ہیں کہ وہ (رسول) اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تم جیسے بدترین بدکاروں میں چالیس برس رہنے کے باوجود کبھی برائی اور بدکاری کے مرتکب نہ ہوئے۔ 'غوی، بداعتقادی کو بھی کہتے ہیں اور 'وما ينطق عن الهوى، سے مراد ہے کہ : گواہ ہے ہر حصہ قرآن کا جب اترتا ہے وہ کہ آپ (رسول اللہ صلعم) نے کبھی بدزبانی کا ارتکاب نہ کیا، گوکہ آپہ سالہا سال، صبح، شام، سفر، حضر میں بھی بدترین لوگوں، بد اعتقادوں اور بدکاروں کی صحبت میں رہے۔ یہ قرآن کہتا ہے، کہ جو بروں کی صحبت میں بیٹھے گا برا ہو جائے گا۔ عام دنیا میں یہی ضابطہ ایک ضرب المثل کے طور پر مشہور ہے، لیکن اللہ اللہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہی ایسی تھی جو اس سے مستثنیٰ رہی اور آپہ کا دامن ہر قسم کی چھوٹی بڑی برائی، اور بدزبانی سے پاک رہا۔ اور قرآن کا ہر حصہ اس بات کی شہادت دیتا ہے۔

حضرت علامہ انتہائی یکسوئی اور شور سے سورہ 'النجم' کی ان

تین آیات کی تفسیر کے مطالعہ میں عموماً تھے اور بہر وقت آمیز لہجے میں فرمایا: یہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار اور تقدس کی صفائی اور گواہی قرآن ہی نے پیش نہیں کی بلکہ خالق کائنات نے ظہور قلبی سے پہلے ان کی فطرت کو ایسے سانچے میں ڈھالا تھا کہ آپس ہر نوع کی آلائشوں سے محفوظ و ماسون رہے۔ قرآن کے ذریعے تو فقط لوگوں کو بتانا مقصود تھا اور حضور کی صداقت بعینہ قرآن کی صداقت ہے۔ علامہ کے لبوں سے حضور کا ورد جاری تھا، اور ان کی نگاہیں اشکبار تھیں۔ وہ حقیقتاً سچے عاشق رسول تھے۔

اسی صحبت میں، میں نے حضرت علامہ کی خدمت میں سورہ النجم کی ان آیات کا پس منظر بیان کرنے کے لئے ابن عباس کی تشریح بیان کی کہ: حق تعالیٰ قرآن حکیم کی قسم اٹھا کر فرماتا ہے کہ قرآن حکیم کو بذریعہ جبرئیل امین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قصہ وار، ایک ایک دو دو، تین تین اور چار چار آئیں کر کے پورے بیس سال میں نازل کیا گیا، اور جب عتبہ بن ابی لہب نے سنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن حکیم کے حصوں کی قسم کھاتے ہیں، تو بولا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تک یہ بات پہنچا دو کہ میں قرآن کریم کے حصوں کا منکر ہوں۔ جب لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ بات پہنچائی تو آپ نے فرمایا کہ اے رب العالمین اپنے درندوں میں سے کوئی درندہ اس پر مسلط کر دے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حران کے قریب ایک شیر کو اس پر مسلط کر دیا، جس کا اس نے اس کے ساتھیوں سے نکال کر قرب و جوار میں لے جا کر سر سے لے کر پاؤں تک چیر بھاڑ ڈالا، لیکن اس کی نجاست کے باعث اس کا چکھا تک نہیں۔ (۱)

:- اقبال کے بعض شیدائیوں کا بیان ہے کہ حضرت علامہ خود قرآن حکیمہ کی تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کیا آپ سے بھی اس موضوع پر کبھی گفتگو ہوئی؟

- میرے ساتھ خصوصیت سے انہوں نے اس موضوع پر کسی قسم کا اظہار خیال تو نہیں کیا تھا، تاہم یہ امر ان کے اس عزم کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے کہ وہ ہر سلاقات میں قرآن کی کسی نہ کسی آیت کے متعلق خلوت میں اور بسا اوقات اپنے بعض مداحوں مثلاً ڈاکٹر محمد دین تاثیر، م۔ش، اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی وغیرہ کی جلوت میں مجھ سے مخاطب ہو کر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔ اس ضمن میں کوئی ایک آیت پڑھ کر ان کا سب سے پہلا سوال یہی ہوتا تھا کہ اس آیت کے مفہوم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور مجھے اس بارے میں جو کچھ معلوم ہوتا، اپنی علمی استعداد کے مطابق عرض کر دیتا اور اگر مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی تو بعض کتب کے حوالے دیکھنے کی خاطر دوسرے روز کی سہلت طلب کر لیتا۔ جتنا عرصہ میں ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتا رہا، میں نے اندازہ لگایا کہ حضرت علامہ عالم شباب ہی میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطہ کی حیثیت سے عصر حاضر میں کایاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ زمانہ حال کے جورس پروڈنس (Jurisprudence) یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسات دلیا کے سامنے پیش نئے جائیں اور دلیل و برہان سے اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے قانون پر ثابت کی جائے۔ میں نے بعد میں کہیں پڑھا کہ ان کی مجوزہ کتاب کا نام تھا (Construction of Islamic Jurisprudence) اور انہوں نے بارہا اس ارادے

کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے (Islam as I understand)

اگر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن حکیم کی تفسیر لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، جیسا کہ آپ نے ان کے بعض شہدائیوں کے حوالے سے سوال کیا ہے، تو سیری ذاتی رائے میں اسلام کے موضوع پر وہ متذکرہ کتابیں بعد میں لکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں گے تاہم یہ امر یقینی ہے کہ ملت دراز سے ان کے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی سرکز قائم کیا جائے، جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کئے جائیں، جنہیں خورد و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے، تاکہ وہ ایک پر سکون گوشے میں بیٹھ کر یکسوئی کے ساتھ اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلامی اور شرع اسلام کے متعلق ایسی ایسی کتابیں مدون کر سکیں، جو دنیائے فکر میں ایک انقلاب برپا کر سکیں۔

س :- مولانا، آپ ان کی شاعری کے کس پہلو کو نمایاں طور پر محسوس کرتے ہیں ؟

ج :- ہر شاعر کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے۔ وہ ایک خاص اسلوب رکھتا ہے یا ایک مخصوص رنگ کے تابع ہوتا ہے، جس سے اس کی عظمت و شوکت آشکارا ہوتی ہے۔ اس رنگ اور اسلوب سے بغاوت کر کے وہ اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن جہاں تک میں نے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے، وہ ایک ہمہ جہتی شاعر ہیں، غزل گو ہیں، قصیدہ خوان بھی، مناظر قدرت اور مظاهر فطرت کے پرستار ہیں اور کشور دل کی تباہی و بربادی کے سوگوار اور ساتھ دار بھی۔ وہ حمد و نعت کہنے کے علاوہ زندگی کے مسائل سے بحث کرنے میں اور فلسفہ کی گتھیاں بھی سلجھاتے

ہیں۔ اقبال کو میں نے جس رنگ میں بھی دیکھا ہے وہ بکتائے روزگار دکھائی دئے ہیں۔

علامہ اقبال نے جو زمانہ پایا، وہ متقدمین اور ستاخرین کو نہیں ملا، جس زمانہ سے اقبال لبرڈ آزما رہے، اس کے مزاج شناس ان کے پیش رو تھے نہ ہمعصر۔ سیرے نزدیک ان کے افکار کی وسعت کا یہی نمایاں پہلو ہے کہ انہوں نے عصر خویش سے اعلان جنگ کیا اور دم آخر تک لڑتے رہے۔ ان کے تیور بدلے نہ عزم و حوصلہ میں کوئی فرق آیا۔ ان کے جوش پیکار اور شوق رزم میں ولولہ انگیزی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس زمانہ کو، اس کے اقتضاء کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ ان کا دل آزاد تھا، ذہن، طبع اور مزاج میں حریت پسندی تھی۔ وہ زندگی بھر غلامی کے خلاف صف آراء رہے، ذہنی غلامی کو جائز سمجھا نہ جسمانی غلامی کو، انہوں نے جو کچھ دیکھا، اپنی آنکھوں سے دیکھا، جو کچھ سنا، اپنے کانوں سے سنا، جو کچھ سوچا اپنے ہی ذہن سے سوچا اور جو فیصلہ کیا، اپنے ہی دل سے کیا۔ افکار و خیالات اور نظریات و تصورات کی درپوزہ گری انہوں نے کبھی نہ کی اور مجھے ان کی شخصیت اور افکار کا یہی پہلو سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہ بات کس قدر السوسناک ہے کہ اکثر لوگ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کی اصل روح کو نہیں سمجھتے اور ان کے کلام کو محض شاعری سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کی طرف خود اقبال نے بھی پیش گوئی فرمائی تھی کہ لوگ میری شاعری کا مطلب اور مقصد نہیں جانتے، میں بتاتا ہوں کہ میری شاعری، میرے دل کی وہ آواز ہے، جس نے ذرہ بے ماہہ میں زندگی کی تڑپ پیدا کی اور وہ آمادۂ جہاد ہے ذوق لمو اور شوق ظہور سے بیتاب ہوا جا رہا ہے :

مثل شرر ذره را تن به تپیدن دهم
تن به تپیدن دهم، بال پریدن دهم

اقبال کا ایک ناکردہ گناہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنا ایک حلقہ سخن بنایا اور اس میں بیٹھ کر عہد حاضر کی فریب کاریوں اور طلسم بندیوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے رہے اور کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے، جو ان کی بات سنتے تھے، اس پر کان دھرتے تھے اور صف بستہ ہونے کی تیاریوں میں رہتے تھے، ان کا اپنا شعر ہے :

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی
اگرچہ تو ہے شال زمانہ کم پیوند

اور یہ ان کی نوائے پریشاں کا اثر تھا کہ غلاموں میں جذبہ حریت بیدار ہو گیا، جو غلامی پر قناعت کر چکے تھے اور جنہوں نے ذلت و خواری کی زندگی کو اپنا لیا تھا اور جو اپنی شکستہ ہری پر خورسند و مسرور تھے، وہ فضائے نیلگوں میں اڑنے کے لئے بیتاب ہو گئے، ان میں شوق پرواز پیدا ہو گیا :

تڑپ رہے ہیں فضائے نیلگوں کے لئے
وہ پر شکستہ کہ صحن سرا میں تھے خورسند

آج اقبال کا یہ شعر خود ان کی زندگی پر صادق آ رہا ہے کہ :

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے تولنگری سے نہیں

اللہ اللہ ! کیا فکر کی وسعت اور بلندی ہے کہ اقبال کہتے ہیں : اگر دلیا میں میرا جوہر آشکار ہوا ہے اور لوگ مجھے سر آنکھوں پہ پٹھانے ہیں، میری قدر و منزلت کرتے ہیں، میری عظمت کے معترف یا میری

بڑائی کے قائل ہیں تو اس لئے کہ میں تو لنگر نہیں ہوں، بلکہ قلندر ہوں۔ مقصود کہنے کا یہ ہے کہ جو شخص زر و دولت پر حریصانہ نگاہیں لہین رکھتا، ایمان و ضمیر کا سودا نہیں کرتا وہ قلندر کے راز کو ہالتا ہے۔

آپ کے خیال میں اقبال کا پیغام (nutshell) میں کیا ہے؟
حضرت علامہ اقبال کا یہ ایمان تھا کہ قرآن کے بغیر مسلمان، مسلمان بن نہیں سکتا:

گر تو سی خواہی مسلمان زیستن
نیست سکن جز بہ قرآن زیستن

ان کا پیغام مختصراً الفاظ میں یہی ہے کہ قرآن کی روشنی میں سچے مسلمان بن جاؤ اور فطرت نے سیری طرح تمہیں جو آب و تاب بخشی ہے، کہ گمراہوں کو راستہ دکھاتا ہوں، جیسے ابر تیرہ و تاو کے اندر سے چمکنی بجلی بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہے، تم بھی ایسے ہی بن جاؤ:

بہ آن آب و تاءے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم جو ابرے بہ ابر سیاہ

۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے اسلامی مثالی معاشرہ کی تشکیل کے خواہاں تھے، آپ کے خیال میں ان کے ذہن میں کس قسم کے مثالی معاشرہ کا نقشہ تھا؟

بے شک وہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک صحیح اسلامی مثالی معاشرہ وہی تھا، جو حضور سرور کائنات کے عہد مقدس میں ظہور پذیر ہوا، اس معاشرہ میں فرقہ

ہندی کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی کیونکہ فرقہ بندی کو قرآن نے کفر قرار دیا ہے، اور حضرت علامہ اس کفر کے شدید مخالف تھے۔ وہ دین کی عظمت و رفعت کے قائل تھے اور اوہام پرستی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ہمارے علماء کرام تنگ نظری تعصب اور فرسودہ توہمات کا شکار ہونے کی بجائے وسیع النظری، کشادہ نظری اور اعلیٰ اقدار کو حرجان تصور کریں اور صحیح اسلامی خطوط کے تحت ایک مستقل نظام کی اساس پر مثالی اسلامی معاشرہ تشکیل کریں، جس میں ایک دوسرے کو کافر کہنے والا کوئی نہ ہو۔ مجھے ان کا وہ بیان آج بھی یاد ہے جو ۴۰ برس قبل اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت علامہ نے فرمایا تھا۔

”تمارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری، سلاؤں اور قیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی، بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے، جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تضاروں اور نئے نصب العین کی اسنگ کو محسوس کرنے لگے۔“ (۱)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کرام سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، کہ وہ نئی نسل کی احسن تربیت میں اپنا بھر پور کردار ادا کر سکیں گے۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اور حضرت علامہ

جس قسم کا مثالی معاشرہ چاہتے تھے وہ تشکیل نہ پاسکا، اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ ہماری سوچ کا مرکز و محور یہی بحث رہی کہ مسلمانوں میں کون مسلمان ہے اور کون کافر؟

اقتصادی اور سیاسی بحرانوں سے تو ملت اسلامیہ کئی بار دوچار ہوئی اور آج بھی تیسری دنیا کے سامنے یہی مسئلہ سر فہرست ہے، مگر یہ جو آپ کے بقول حضرت علامہ نے مذہبی بحران کا ذکر کیا، اس سے ان کی مراد کیا تھی۔؟

عزیزم میں دسمبر ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوا، اس لحاظ سے میری عمر ۸۲ سال ہو چکی ہے، لیکن میری ساری زندگی ان ہی لغتوں میں گزری ہے، جنہیں بعض لوگ کفر کے قتلے کہتے ہیں۔ یہ قتلے کئی بار حضرت علامہ کی زندگی میں بھی مجھ پر لگائے گئے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے پایہ استقلال میں رائی بھر لغزش نہ آئی، میں ثابت قدم رہا، کیونکہ میں فتویٰ لگانے والوں پر ایمان نہیں لایا تھا، میں قرآن پر ایمان لایا ہوں اور جو قرآن پر ایمان لایا ہو، اس پر کوئی بھی فتویٰ اثر نہیں کرتا۔ میں زمانہ شناس تھا۔ اس لئے کئی بار مذہبی بحران سے گزرا۔ میں جب اس موضوع پر گفتگو کرتا ہوں، تو میری نگاہوں کے سامنے وہ حالات متحرک تصویروں کی صورت میں آنے لگتے ہیں جب ذرا ذرا سی بات پر ”اسلام خطرے میں ہے“ کا شور سنائی دینے لگتا ہے۔ ایک بار بمبئی کی ایک مسجد میں بجلی کا پنکھا لگا دیا گیا، تو بعض سولویوں نے مسلمانوں کو وہاں نماز پڑھنے سے روک دیا کہ پنکھا شرک ہے اور اس کی آواز اور ہوا نماز میں مغل ہوگی، لہذا کفر ہے، اس لئے اس مسجد میں نماز نہ پڑھی جائے، اس پر حضرت علامہ، سولانا ظفر علی خان کے ساتھ میرے ہاں تشریف لائے اور استمداد کے طالب ہوئے،

میں نے انہیں ایک تفصیلی جواب لکھ کر دیا کہ اسلام ہرگز خطرے میں نہیں اور ہنکھنے کی ہوا تو اللہ کی ایک نعمت ہے، جو خشوع و خضوع سے نماز ادا کرنے والوں کے ہسینے کی بدبو کو بھی جنت کی عطر بیز ہواؤں میں شامل کر دے گی۔ یہ مضمون 'زمیندار، اخبار میں شائع ہوا، تو مولویوں نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور میں حاسوٹن رہا۔

س :- مولانا، لیا دنیا کی عظیم بادشاہی مسجد، لاہور میں خطابت کے عہدے پر فائز ہونے کا بھی یہی پس منظر ہے۔ ؟

ج :- جی ہاں ! ایک وقت وہ بھی آیا، جب اللہ اکبر کی صدا کو دور دور تک پہنچانے کے لئے مساجد میں لاؤڈ سپیکر لگائے گئے تو بعض جید علماء کرام نے اس اقدام کو بھی کفر قرار دیا اور چند ایک نے تو لاؤڈ سپیکر کی موجودگی میں مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس موقع پر بھی ان ملاؤں کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کیا، تو مجھ پر ایک اور کفر کا فتویٰ لگا دیا گیا۔ اس دوران میں "قبروں کا فتنہ"، برہا ہو چکا تھا، جس کے نتیجہ میں الجن خدام الحرمین، بنائی گئی۔ اس کے کرتا دھرتا علی برادران تھے، انہوں نے ایک جلسہ منعقد کرنا چاہا کہ حج کا بائیکاٹ کیا جائے۔ الجن ہذا کا موقف یہ تھا کہ چونکہ سعودی حکومت نے اپنے ملک سے قبروں کے نام و نشان مٹا دئے ہیں، لہذا احتجاج کے طور پر حج کا بائیکاٹ کیا جائے، یہ تھی قبروں کے فتنہ کی تحریک — — جس کا غوغا سن کر مولانا ظفر علی خان بیرے ہاس چل کر آئے، اغلباً یہ ۱۹۲۵ء کا واقعہ ہے۔ مولانا نے انہدام القبور، انہدام القباء وغیرہ عنوانات کی کئی کتابیں اور محفلت مجھے دکھائے اور کہا کہ اس موضوع پر دیوبندی اور وہابی تک لہس بول رہے،

آپ ہی دو چار سطریں لکھ دیجئے، میں نے ان کے اصرار پر ایک تفصیلی مضمون لکھا جو تین اقساط میں مولانا ظفر علی خان کے اخبار ’زمیندار‘ میں شائع ہوا۔ اس کی سرخی مولانا غلام رسول سہر نے ’اجتماع جیوش اسلامیہ‘، تجویز کی۔ سیرے اس مضمون کا لب لباب یہ تھا کہ اے برصغیر کے مسلمانو! سوچو تو ذرا، ان قبوں کے سمار ہونے کی خبر تمہیں انگریز سرکار نے پہنچائی ہے، جس کو تم اپنا دشمن سمجھتے ہو، تم میں سے کہا کسی نے کوئی قبہ خود اپنی آنکھوں سے گرا ہوا بھی دیکھا ہے۔؟ پھر تم حج کا بائیکاٹ کیوں کر رہے ہو؟ سوال یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کی روشنی میں مسلمہ شترکوں کے اقتدار میں ان کی شرائط و قیود کے مطابق خانہ کعبہ کا طواف کیا اور عرفات و مزدلفہ میں قیام کیا، تو سعودی فرمانروا کی موجودگی میں تم حج کا بائیکاٹ کیوں کر کرو گے۔؟ اور یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ اگر ایک آدمی بالفرض سٹی اور اینٹوں کے قیے گراتا ہے، تو تم خدا کے گھر کے دشمن بن جاؤ۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد علامہ اقبال نے مجھے یاد کیا۔ میں حاضر ہوا۔ گزشتہ تین روز کے اخبارات ان کے سامنے تھے۔ آپ نے سیری طرف دیکھا، ہنس کر فرمایا: بدو-بولوی! تیری خیر نہیں۔ مزید فرمایا: باتیں تو ساری ٹھیک ہیں، مگر تمہاری شنوائی نہیں ہوگی۔

اور علامہ کا یہ اندیشہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوا۔ الجن خدام الحرمین کے جلسہ عام میں، مجھ پر نعن طعن کی گئی، صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ حج کے بائیکاٹ کی قرارداد (Resolution) پاس کرنے سے پہلے جس شخص کا یہ مضمون تین قسطوں میں شائع

ہوا ہے، اور جو حنفیوں کے دارالعلوم میں صدر مدرس ہے، اس کو کافر قرار دو اور جو اس کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر، اور مطالبہ کرو کہ اس شخص کو ملازمت سے برخاست کیا جائے، ورنہ دارالعلوم کے لئے چندہ بند کرنے کی مہم شروع کر دی جائے گی۔ ایک پیر صاحب نے اس قرار داد کی تائید کی۔ وہ میرے ضلع کے تھے اور میں جلسہ سے قبل انہیں اپنے ہاں چائے پر دعوت دے چکا تھا۔ رات کو میرے خلاف کفری قرار داد پاس ہوئی، اگلے روز میں انہیں اپنے غریب خانے پر لانے کے لئے بازار حکیمان پہنچا جہاں وہ اقامت پذیر تھے، پیر صاحب اور میں دونوں چلے آ رہے تھے اور سب لوگ انگشت بدنداں تھے۔ اتفاق سے راستے میں حضرت علامہ مل گئے، انہوں نے آگے بڑھ کر ہم سے سوال کیا کہ آپ دونوں میں سے مسلمان کون ہے؟ پیر صاحب خاموش رہے، میں نے بر جستہ کہا: پہلے یہ اور پھر میں۔ اور علامہ مسکرا کر بازار حکیمان کی طرف چل دئے۔

چائے کی دعوت میں پیر صاحب نے اس موضوع کو پھر زہر بحث میں لانا چاہا، مگر میں نے انہیں روک دیا اور کہا کہ جو کچھ ہوا، ایسے بھول جائیے، سیری تو ساری زندگی ان ہی ہنگاموں میں گزری ہے اور مجھے ان فتوؤں کی کوئی پرواہ نہیں۔ گویا کیفیت یہ تھی کہ ع:

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہو گیا

اس روز مجھے دارالعلوم نعمانیہ کی طرف سے ملازمت سے سبکدوشی کا پروانہ مل گیا۔ قبل ازیں میں پہلے ہی استعفیٰ پیش کر چکا تھا، کیونکہ تحریک خلافت میں دارالعلوم کا ایک ایک رکن میرے خلاف ہو چکا تھا جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، بہر حال میں اپنے اس مکان سے ملتے ”اولیٰ مسجد“ میں آ گیا۔ اور پھر حضرت علامہ کی

کوششوں سے مجھے بادشاہی مسجد کی خطابت مل گئی، جہاں میں نے لاؤٹسپیکر کے ساتھ پہلا جمعہ پڑھایا۔ تو صف اول کے نمازیوں میں حضرت علامہ بھی شریک تھے۔ میں نے اس روز اجتہاد کے موضوع پر تقریر کی۔

س :- مولانا ! کیا حضرت علامہ بھی اجتہاد کے قائل تھے - ؟

ج :- وہ تو خود سراہا اجتہاد تھے۔

س :- ان کا نظریہ اجتہاد کیا تھا - ؟

ج :- علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ اجتہاد بڑا واضح تھا، وہ احکامات جن کی قرآن حکیم نے کوئی تاویل یا کیفیت متعین نہیں کی، حضرت علامہ کا ان کے بارے میں نظریہ تھا کہ انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ حضرت علامہ کا یہ ایمان تھا کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے، جو قیامت تک رہنمائی کے لئے نازل کی گئی ہے اور اس کی ہدایتیں ہم سب کے لئے نجات اخروی کا باعث ہوں گی۔ نیز قرآن نے بعض احکامات کی کیفیت بیان نہیں کی مثلاً جرم و سزا وغیرہ کی نوعیت، کیونکہ جیسے جیسے جرائم کی رفتار اور اس کی صورتیں بدلتی رہیں گی، ویسے ہی اس کی سزاؤں میں بھی تبدیلی لازماً ہوگی، لہذا وہ لوگ جو قرآن کی ہدایات کو سمجھتے ہیں، حضرت علامہ ان سے بڑی توقعات رکھتے تھے کہ وہ اجتہاد کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں۔

س :- اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، کیا ہم اس کے مطابق

صحیح رخ پر آگے بڑھے ہیں ؟ اگر نہیں بڑھے تو کیوں ؟ اس خواب کو

حقیقت میں بدلنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟

ج :- سیرے خیال میں حضرت علامہ کے جہان نو کا خواب ابوی تک شرمندہ تبیر نہیں ہو سکا اور ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے تھے، بلکہ ایک لحاظ سے پیش رفت کی بجائے ”ترقی معکوس“ ہوئی ہے۔ کیونکہ ہم میں بہت سی اخلاقی برائیاں راہ پاگئی ہیں۔ ہم نے اپنا چلن چھوڑ دیا ہے اور غیر قوموں کے شعار کو اپنا کر اپنا سلی شخص گنوا بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے ملک میں ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں انتشار و افتراق کا شکار ہو چکے ہیں۔ انگریز کی جس چالاکی کو علامہ اقبال رحمہ اور سنوسی رحمہ ایسے رہنماؤں نے بھانپ لیا تھا، وہ آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔ چوبیس لاکھ یہودی، بارہ کروڑ عرب مسلمانوں کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہیں۔ وہاں نہ دولت کام آتی ہے نہ تیل۔ فی زمانہ نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کا شفر مسلمانوں کے اتحاد کی ضرورت ہے۔ وہ اتحاد جس کے پس پردہ حضرت علامہ، مسلمانوں کے لئے جہان نو کا خواب دیکھ رہے تھے، آج اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

س۔ سید صاحب! آپ ایسے بزرگ اور قابل احترام استاد کو حضرت علامہ اقبال سے ارادت مندی کا شرف حاصل ہے۔ کیا آپ گزریے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرنا پسند کریں گے؟

ج۔ عزیزم، میں حضرت علامہ اقبال کا وہ ارادت مند ہوں جس کی حیثیت اس شخص کی سی ہے جو مرد کامل کے کمال یا جمال کے محض تصور یا اس کی دید ہی سے حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ میں ۱۹۲۶ء سے تا ایام وفات حضرت علامہ اقبال کے آستانے پر حاضر ہوتا رہا، مگر پچھلی صفوں

کے خاصوش تماشائی کی طرح، اپنی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ ان سے ملاقات اور گفتگو کے موقعے بھی ملے، مگر ان گفتگوؤں کو کبھی چھپوایا نہیں۔ کیونکہ مجھے اپنی کم علمی کا پورا احساس رہا، سبدا میں علامہ کے ملفوظات کو نقل کرنے میں ٹھوکر کھا جاؤں۔

س۔ حضرت علامہ سے آپ کی براہ راست ملاقاتیں بھی تو ہوئی ہوں گی؟

ج۔ جی ہاں، اس موضوع پر میں پہلے بھی اظہار خیال کر چکا ہوں اور آج پھر عرض کروں گا کہ براہ راست ملاقاتیں بہت ہوئیں جن کے سدھم تاثرات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ مگر دو تین غیر معمولی موقعے ایسے بھی ملے جن کی یاد آج تک محو نہ ہوئی، ویسے مجھے اسید ہے کہ ان کا تذکرہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوا اور براہ راست ان سے بات چیت کرنے کا موقعہ ملا۔ میں اس زمانے میں، پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی تفصیلی فہرست بنانے پر مامور تھا اور میرے کام کے نگران پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر محمد اقبال اور حافظ محمود خان شیرانی تھے۔ پروفیسر محمد شفیع نے مجھے حکم دیا کہ میں فخری بن اسیری کا ”انتخاب شعرائے فارسی“ لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری دوں اور انہیں وہ کتاب دکھاؤں۔ اس کتاب کا نام ”تحفة العیب“ ہے۔ اس میں مصنف نے فارسی شاعروں کی غزلیات کو اس طریق سے جمع کیا ہے کہ مختلف شعرا کی ہم طرح غزلیں یکجا ہو گئی ہیں۔

حضرت علامہ نے مجھ سے کتاب لی اور ورق گردانی شروع کر دی۔ ساتھ ساتھ پینسل سے اشعار پر نشان لگاتے گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ انتخاب

اشعار پروفیسر شفیق صاحب کی فرمائش پر کیا جا رہا ہے۔ شاید شفیق صاحب اس زمانے میں فارسی نصاب (۱) مرتب کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ اس انتخاب میں حضرت علامہ کے ذوق کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس انتخاب میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت انہوں نے صرف کیا ہوگا۔ جب فارغ ہوئے تو مجھ سے دریافت کیا۔ ”بھائی! فارسی کے طالب علم ہو یا عربی کے،“؟

میں نے عرض کیا: ایم۔ اے فارسی میں کیا ہے مگر عربی مسجدوں میں بڑھی ہے۔

فرمایا: عربی والا جب فارسی میں آتا ہے تو فارسی اس کے لئے مشکل نہیں رہتی۔

وہ فرماتے گئے میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں ان کی باتوں کا کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے فرمایا: یہ کاغذ لو، اور اس پر خواجہ حافظ اور جاسی کی وہ غزلیات لکھ دو جن کے مطلع یہ ہیں۔

شاہ شمسداد قدان خسروشیریں دھناں

کہ بڑگان شکند قلب ہمہ صف شکناں (حافظ)

اے ہمہ سیم بران سنگ تو بر سینہ زناں

تلخ کام از لب سے گون تو شہریں دھناں (جاسی)

اس اثنا میں وہ گنگناتے رہے۔ جب میں لکھ چکا تو فرمایا۔ ”تم فارسی کے فارغ التحصیل ہو، بتا سکتے ہو ان میں سے کون سی غزل اچھی ہے۔ سیری سمجھ میں کچھ لہ آیا کہ کیا جواب دوں۔ بہر حال میں نے

(۱) یہ مجموعہ بعد ازاں ”سید گل“ اور ”گلشن معانی“ کے نام سے شائع ہوا۔

عرض کیا کہ حافظ کی غزل اچھی ہوگی۔

فرمایا ”یہ حافظ کی جادوگری کا اثر ہے۔ ورنہ شیراز اور خراسان کا فرق تو واضح ہے۔ شیرازی میٹھی باتوں سے دلوں کو لبہارہا ہے اور ہرات والا کوہستانی لہجے میں بات کہہ رہا ہے اور ہم لوگوں کو کوہستانی لہجے کی اب زیادہ ضرورت ہے۔“

اس کے بعد جاسی کی غزل تحت اللفظ پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی رگ رگ میں شعر اثر کر رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی اور فرمایا کہ ”پروفیسر شفیع سے کہنا مجھ سے ذرا سل لیں۔“

علامہ اقبال کی خدمت میں حاضری کا دوسرا موقعہ مجھے ۱۹۳۰ء میں سلا۔ لاہور میں ہم لوگوں نے ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ خواجہ عبدالوحید صاحب (۲) اس کے سیکریٹری تھے۔ ہم نے ارادہ کیا کہ علامہ اقبال کی تعلیمات کو عام کرنے کے لئے یوم اقبال منایا جائے۔ یہ برصغیر ہند و پاکستان میں پہلا ”یوم اقبال“ تھا۔ ہم اس سلسلہ میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ وہ ایک شام ہوٹل سٹفلز (۳) (Stiffle's) میں عقیدت مندوں کے ساتھ جائے پئیں۔ علامہ نے یہ دعوت قبول فرمائی۔

گفتگو سے قطع نظر۔ سٹفلز میں ان کی آمد، ان کا حلیہ۔ مشہدی لنگی وغیرہ تمام جاذب نظر تھیں۔ ان کی شخصیت میں تمکنت اور وقار تھا۔ یہ مجلس بھی بااثر اور ایک یادگار موقعہ تھا اس مجلس میں علامہ اقبال نے تقریر بھی فرمائی۔ اس کا خلاصہ جو مجھے یاد ہے حسب ذیل ہے :-

(۲) مصنف ”کتابیات اقبال“

(۳) یہ ہوٹل شاعرہ قائد اعظم (مال روڈ) پر واقع تھا اور اب ختم ہو چکا ہے۔

”میں شاعر نہیں ہوں، شعر شناس ہوں اور حکمت زندگی اور حکمت دین کا طالب علم ہوں۔ سیری آرزو ہے کہ میں اپنے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں پر دین کے اسرار منکشف کر جاؤں تاکہ وہ دین کے قریب آجائیں۔“

ملاقات کا تیسرا سوقفہ مجھے اس زمانے میں ملا جب علامہ اقبال مدراس لیکچرز کی تیاریاں کر رہے تھے مجھے پیغام بھیجا کہ لائبریری میں فلسفہ کی عربی و فارسی کی جو کتابیں ہیں ان کی فہرست بنا کر حاضر کروں۔ جب میں حاضر ہوا تو فرمایا : ”مسلمانوں میں دین والا آدمی جب فلسفے کی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے تو اس کی بات میں وقار اور وزن پیدا ہو جاتا ہے مگر محض فلسفے والا آدمی جب دین کی بات کرتا ہے تو اس کی نہ فلسفیانہ حیثیت ہوتی ہے نہ دینی لحاظ سے اس میں وزن،“

س۔ سید صاحب ! کیا اقبال کی شاعری میں ابدیت کے عناصر ہیں یا نہیں ؟

ج۔ اقبال نے بہت سے سوقفوں پر خود کو شاعر فردا قرار دیا ہے یا بالفاظ دیگر ”حکیم آئندہ“ . . . کیونکہ اقبال خود کو شاعر یا غزل خوان نہیں کہتے تھے۔ بلکہ اپنے اس لقب کو باعث عار سمجھتے تھے . . . تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ شاعر بھی تھے اور ایک ایسی ادبی روایت یا ادبی فکر کے مؤسس تھے جس سے ہمارا ادب و شعر ایک نئے شعور سے آشنا ہوا۔ اور اس سے وہ بھل بھول پیدا ہوئے جن کی تازگی شگفتگی، رس جس اور قوت و توانائی سے ادب و شعر کی دنیا اب تک ایک نئی زندگی محسوس کر رہی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔

اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں شاعری اور ادب کی اس اہمیت پر خود بھی زور دیا ہے اور لکھا ہے۔ ع

ملت ہے شاعرے البار گل

شاعر نے بغیر کوئی قوم صحیح معنوں میں قوم ہی نہیں ہوتی، تودہ گل بنی رہتی ہے۔ تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال کو شاعر کہہ دینے سے کوئی مضائقہ نہیں، مگر ایسے شاعر جو حکیم بھی تھے۔ درحقیقت وہ ایسے شاعر تھے جن کی شاعری نے ملت کے جسم میں، جو ایک معنی میں راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی، زندگی کی روح بھونکی اور ”انبار گل“ کو ایک زندہ اور باشعور قوم میں بدل دیا۔

یہ سب کچھ اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال شاعر تھے اور شاعر ملی بھی۔ مگر کیا وہ شاعر فردا بھی ہیں؟ اس کا جواب اس وضاحت پر منحصر ہے کہ یہاں شاعر فردا سے مراد کیا ہے؟ شاعر فردا وہ شاعر ہے جس کی شاعری اپنے مستقبل اور ہائیداری معانی و افکار کی بدولت آج کی طرح کل بھی . . . یعنی صدیوں تک . . . زندہ و پائندہ رہنے والی ہو، جس کے لہجوں سے کل کے لوگ بھی آج کی طرح محفوظ ہوں اور جس کے پیغام سے آنے والی نسلیں . . . یعنی آئندہ کے انسان اسی طرح تسکین و قوت کا سامان حاصل کریں۔ جس طرح آج کے انسان تسکین و قوت کا سامان حاصل کر رہے ہیں۔ یہ صفات کلام اقبال میں موجود ہیں۔

س۔ سید صاحب، آپ کے خیال میں، اقبال کے ہاں، اچھے انسان کا تصور کیا ہے؟

ج۔ اقبال نے اپنے ہستیہ انسانوں کے حقیقی اور زندہ نمونے ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ مثلاً آنحضرتؐ کے علاوہ صحابہ کرامؓ، حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، شہر حق (اسرار ص ۳۰) حضرت ابوذرؓ، حضرت بلالؓ وغیرہ اور ان کے علاوہ بعض سلاطین، بعض اولیائے کرامؓ اور بعض دوسرے رجال و زعماء

جن کے اوصاف میں کبھی عام طور سے کبھی خاص طور سے اقبال کے پسندیدہ انسان کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔

اقبال کے ہاں بعض شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن کی مثالیت کامل نہیں بلکہ کسی ایک وصف خاص میں وہ نمایاں ہیں، اور یہ سیاق و سباق سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہاں اقبال کی پسند کی وجہ کیا ہے؟

اقبال کے ہاں اچھے اور بلند انسان کی جھلک ان کی کتابوں میں بکھری ہوئی صورت میں جا بجا ملتی ہے لیکن یک جا مربوط تصویریں بھی موجود ہیں۔ مثلاً اسرار خودی میں، خودی کی تربیت کے ضمن میں۔ عشق و محبت کی اہمیت کے بعد اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الہی کے ذمے داریوں کی صلاحیت مثلاً ذکر و فکر اور فقر غیور وغیرہ کا ذکر کر کے ان دوسرے خصائل کا بھی ذکر کیا ہے جو اقبال کے ”اعلیٰ انسان“ کے لئے ضروری ہیں۔ پھر ان عیوب کا بھی ذکر کیا ہے جو پسندیدہ انسان کو اپنے مقام سے گرا دیتے ہیں۔ مثلاً حرص، خوف، غم اور وسوساں، اس کے علاوہ وہ احتیاج جو انسان کو سوال پر مجبور کر دے۔

س۔ اقبال کا آنے والی شاعری پر کیا اثر ہوا؟

ج۔ قابل غور مسئلہ یہ ہے کہ اقبال کے فوراً بعد فکر اقبال کے خلاف دانستہ یا نادانستہ مخالفانہ تحریکیں کیوں اٹھیں اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ان کی نوعیت کیا تھی؟

سری چھان بین کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے نمایاں رد عمل سیراجی کی صورت میں ہوا۔ سیراجی کی تحریک اکثر صورتوں میں اقبال کے خیالات کی ضد تھی، اس کے علاوہ مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ سیراجی کی شاعری لفظی سوسپٹی اور رسز کی شاعری تھی اور اس حد

تک مجھے اس کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اس فکر پر ہے جو سیراجی کی شاعری میں موجود ہے۔ میں اقبال کے ساتھ سیراجی کو اس لئے معرض بحث میں لا رہا ہوں کہ اقبال کے افکار کے ساتھ ساتھ ان ”خودی شکن“ افکار کا تصور بھی سامنے آجائے جن کے خلاف حضرت علامہ نے عمر بھر جہاد کیا، تعجب کی بات یہ ہے کہ شاعر مشرق نے جس ارضیت اور زمین پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا وہی پاکستانی قوم کے ادب پسند حصے کے ایک سوئز فرغے کا مذہب ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کے الفاظ اور اصطلاحیں تراشی گئی ہیں مثلاً اس ملک کا اصلی کلچر، اس ملک کی بو باس، اس ملک کا زمینی کلچر، وغیرہ وغیرہ۔ پھر ادب کے نام سے ہندو دیومالا اور زمین کی پرستش کا سبق دیا جا رہا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا سیراجی سے ہوئی۔ اس لئے سیراجی کا میں خاص ذکر کر رہا ہوں۔ سیراجی کے اثرات اب بھی گہرے ہیں۔

س۔ اقبال کا ایک اجنبی سوسائٹی کا تصور کیا ہے ؟

ج۔ اقبال کی نظر میں ہر چند کہ فرد و اجتماع دونوں ضروری ہیں اور اجتماع کی فائق حیثیت مسلم ہے مگر ان کے نزدیک فرد اجتماع کا وہ سنگ بنیاد ہے جس کی صحیح تربیت سے اچھا اجتماع اور اچھا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اس لئے اقبال نے بعض دوسرے سوشل فلسفوں کے برعکس فرد کو محض پرزہ اور اجتماع کا بے شعور کارندہ قرار نہیں دیا بلکہ ان کی نظر میں یہ ایک ایسا خود آگہ جز ہے جو اگرچہ خود کے شعور سے بھرپور ہے مگر یہی معرفت اسے یہ بھی سکھاتی ہے کہ اجتماع کے لئے قربانی ہی میں خود کی بقا ہے۔ اور یہ حقیقت اقبال کی کتاب ”رسوز بے خودی“ میں بیان ہوئی ہے۔

س۔ ڈاکٹر صاحب، اقبالیات کے سلسلہ میں جو کام ہو رہا ہے، کیا آپ اس سے مطمئن ہیں؟

ج۔ آج تک اقبال پر اور ان کے کلام کے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اقبالیات کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔ درحقیقت ابھی تک مطالعہ اقبال کی تحریک صحیح معنوں میں شروع ہی نہیں ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے لئے کئی علوم کی ضرورت ہے۔ مشرق و مغرب کے عام علوم، اسلامی علوم کے استخراج کے ساتھ سیکھے جائیں۔ محض جدید تعلیم صحیح اقبال شناسی پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ سیری رائے میں قابل توجہ اسوجن پر اقبالیات کے بارے میں کام کرنا باقی ہے یہ ہیں:

۱۔ اقبال کے ساخذ کا مسئلہ۔

۲۔ اقبال کے اہم موضوعات کی وضاحت کا مسئلہ۔

۳۔ اقبال کے علم کلام کی تدوین کا مسئلہ۔

۔۔ پاکستان کے نصب العین میں فکر اقبال سے استفادہ، کس طرح کیا جائے۔

۵۔ فکر اقبال کے دبستان کا قیام۔ اسلامی طرز تفکر۔ اسلامی قانون۔ ہمیں اسلامی طرز حیات اور اسلامی مملکت کے رجحانات کو فروغ دینا چاہئے اور یہ آخری معاملہ قوم کی توجہ چاہتا ہے، اور اقبال پر کام کرنے والی مجالس کا فرض یہ ہے کہ لوگوں میں صحیح تحقیقی سپرٹ پیدا کریں۔ محض جذباتی انداز کی اقبال پرستی کافی نہیں۔ بلکہ علمی بنیادوں پر کام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور توفیق سرے رب کے ہاتھ میں ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

س۔ ازراہ کرم بتائیے کہ آپ اقبال سے کب اور کہاں ملے؟

ج۔ علامہ اقبال کی نظمیں تو میں بچپن ہی سے پڑھ رہا تھا اور ان کے نام سے بخوبی واقف تھا۔ میرے ایک بزرگ شکوہ اور جواب شکوہ مجھ سے اکثر پڑھا کرتے تھے یہاں تک کہ مجھے از برہوگئی تھیں۔ میں نے حضرت علامہ کو دور دور سے دیکھا بھی تھا۔ پھر چند نظمیوں بالخصوص ”خضر راہ“ اور ”طلوع اسلام“ ان کی زبانی خاص لے میں بہت قریب سے سنیں، جن کا کیف و سرور آج تک محسوس کر رہا ہوں، مگر میری پہلی ملاقات ان سے اس زمانے میں ہوئی جب وہ ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں لاہور کے شہری حلقے کی طرف سے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے امیدوار کھڑے ہوئے۔ شہر کے دوسرے علم دوست نوجوانوں کی طرح میں بھی حضرت علامہ کے زبردست حامیوں میں تھا اور ان کی انتخابی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے رضاکارانہ کام کر رہا تھا۔

ایک روز ملک لال دین قیصر، پروفیسر محمد دین تاثیر سولوی محمد بخش مسلم اور شیخ غلام مصطفیٰ حیرت کے ہمراہ میں حضرت علامہ کی خدمت میں سیکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں حاضر ہوا۔ الیکشن کے کرتا دھرتا میرے یہی دوست تھے جو علامہ کے خاص عقیدت مند تھے۔ علیک سلیک کے بعد پچھلی کارگزاری اور آئندہ لائحہ عمل کے متعلق باتیں شروع ہوئیں۔ رازداری کے خیال سے یا ویسے ہی علامہ نے ایک دفعہ سری جانب یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”یہ اجنبی کون ہے؟“ ڈاکٹر تاثیر مرحوم نے سیرا تعارف کرایا اور کہا۔ ”یہ

نہایت غلغلہ اور خاسوشی و زکر ہیں!،، حضرت علامہ نے ایک بار پھر
سیری طرف غور سے دیکھا اور فرمایا:

”ہاں! کام کرنے والے خاسوش ہی ہوتے ہیں۔“

کچھ دیر ضروری باتیں ہوئیں اور ہم اجازت لے کر واپس چلے آئے اور
اس وقت تک سرگرم کار رہے جب تک حضرت علامہ تین ہزار سے زائد
ووٹوں کی اکثریت سے اپنے حریف کو شکست دے کر کامیاب
نہیں ہو گئے۔

اس پہلی ملاقات کے بعد کئی جلسوں اور تقریبات میں حضرت علامہ سے
ملنے کا اتفاق ہوا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے جلسوں میں بھی پروفیسر محمد
علم الدین سالک کے ہمراہ میں برابر شریک ہوتا رہا، اس وقت جب
اس کے صدر سہیرا بشیر الدین محمود تھے اور اس وقت بھی جب اس کے
صدر علامہ اقبال تھے۔ مگر حضرت علامہ کے سامنے لب کشائی کی
جرات کبھی نہیں ہوئی۔ ہمیشہ توجہ سے ان کی حکیمانہ باتیں سنتا
اور چپ چاپ اپنا کام کرتا رہا۔ میں جب بھی ان کی صحبت سے اٹھ کر آتا
تھا تو ان کے تبصر علمی کا گہرا نقش لے کر اور محبت رسول ص کے جذبے
سے سرشار ہو کر آتا تھا۔

س۔ آپ کے خیال میں علامہ اقبال کے نظام فکر کا مرکزی نقطہ کیا ہے؟
وہ کس بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے؟

ج۔ اقبال کے اس نظام فکر اور حکیمانہ تعلیمات کا سرچشمہ صرف ایک تصور
ہے جسے انہوں نے ”خودی“ کا نام دیا ہے۔ ان کے باقی تصورات
اسی ایک تصور کے گرد گھومتے اور اسی کے حاصلات و مضمرات ہیں
اور اسی سے علمی اور عقلی طور پر وابستہ ہیں۔ اس تصور کو خودی
کا نام دینے کے لئے بھی اقبال کو سخت کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔

الہوں نے خودی کے لفظ کو جو غرور اور تکبر کے برے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، خود اعتمادی، خود داری، عزت نفس اور حفاظت نفس کے نئے معنی پہنائے اور سب کو چولکا دیا۔ انہوں نے دعوت دی کہ اس عالم کی حقیقی نجات یا معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کاسیابی و کامرانی اسلامی اصولوں کی پابندی اور ان کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ وہ ارکان اسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اس بنا پر کہ انسانی ذہن فکر اسلام سے انحراف کر ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اپنے اشعار میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث اور استدلال ایک قاضی اور حکیم کے انداز سے کرتے ہیں۔

س۔ اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا کیا وہ حقیقت میں تبدیل ہوا؟

ج۔ ایک دفعہ الہوں نے فرمایا کہ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ احترام انسانیت کے دوس پر مرتکز نہ کر دیں گی، یہ دنیا بمستور درندوں کی ہستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک نام نہاد جمہوریت، ناپاک قوم پرستی اور ذلیل سلوکیت کی لغتوں کو ہاش ہاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ”الخلق عیال اللہ“ کا قائل نہ ہو جائے گا، انسان اس دنیا میں فوز و فلاح اور کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندہ معنی نہ ہوں گے۔ میرے نزدیک ان کے ’جہان نو‘ کا خواب اور ان کا بیخام یہی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ہم اقبال کے جہان نو کی سمت میں آگے بڑھے ہیں یا نہیں، تو اس کا فیصلہ ہم خود کر سکتے ہیں۔ ہر

انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنا سواخندہ و احتساب خود کرے، میں اگر اس موضوع کی طرف آگیا تو شکوہ و شکایت کا دفتر کھل جائے گا۔ بہتر ہے کہ ہم اپنے ماضی کی کج ادائیگیوں کو بھول کر اپنے بہتر مستقبل کی طرف تمام تر توجہ مرکوز کریں۔

س۔ قریشی صاحب! آپ کا خاص موضوع کشمیر ہے۔ اقبال کا تعلق بھی کشمیر سے بہت زیادہ تھا، آپ اس بارے میں بھی کچھ فرمائیں گے؟

ج۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اقبال علیہ الرحمۃ کشمیری الاصل تھے اور ان کے آباء واجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ چنانچہ وہ خود بھی لکھتے ہیں۔

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے
اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورئے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد
جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

یہ بھی آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ان کے بزرگ کشمیری پنڈتوں کا "سپرو گوت" سے تعلق رکھتے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور "جن کا ذہانت اور فلسفہ دانی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور غالباً ازروئے قانون توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا تھا،۔ ان کے کلا میں بھی جگہ جگہ اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں :

مرا بنکر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی
برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است
یا

میر و مرزا بہ سیاست دل و دین باختم اند
جز برہمن ہسرے محرم اسرار کعباست

وہ اپنائے وطن کی محبت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ انہوں نے اپنے قہ

و عمل سے کشمیر اور اہل کشمیر کی ہمیشہ رہبری کی اور ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا۔

اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہوگا کہ فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری کے چند بزرگوں نے ایک ”انجمن کشمیری مسلمانانہ“ کے نام سے قائم کی جس کے اغراض و مقاصد (۱) اصلاح رسوم شادی و غمی (۲) کشمیری مسلمانوں میں تعلیم، تجارت، صنعت و حرفت اور زراعت کو رواج دینا (۳) قوم میں اتحاد و اتفاق بڑھانا وغیرہ تھے۔ اقبال اس وقت سیالکوٹ سے نئے نئے لاہور آئے تھے اور گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے کے ایک ہونہار طالب علم تھے۔ وہ اس انجمن کی کارروائیوں میں سرگرم حصہ لیتے تھے۔ اس انجمن کی تاسیس پر اقبال نے ایک نظم بھی پڑھی جس کے چند شعر یہ ہیں :

کیا تھا گردش ایام نے مجھے محزون
بدن میں جاں تھی کہ جیسے قفس میں سیدزیوں
جو سامنے تھی مری قوم کی بری حالت
اسنڈ گیا سری آنکھوں میں خون کا سیحوں
انہیں غموں میں مگر مجھ کو اک صدا آئی
کہ بیت قوم کی اصلاح کے ہوئے سوزوں
ہزار شکر کہ ایک انجمن ہوئی قائم
یقین سے راہ پہ آئے کا طالع واڑوں
ملے گا منزل مقصود کا پتا ہم کو
خدا کا شکر کہ جس نے دئیے یہ راہنوں
خدا نے ہوش دیا متفق ہوئے سارے
سمجھ گئے ہیں تری چال گنبد گردوں

بڑھے بہ بزم ترقی کی دوڑ میں یارب
 کبھی نہ ہو قدم تیز آشنائے سکوں
 جو دوڑ کے لئے میدان علم میں جائیں
 سبھوں سے بڑھ کے رہے ان کے فہم کا گلگوں
 دکھائیں فہم وزکاہ و ہنر یہ اوروں کو
 زمانے بھر کے یہ حاصل کریں علو و فنوں

یہ نظم اگرچہ بالکل ابتدائی شق کے زمانے کی ہے تاہم اس میں ماضی
 و حال کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور مستقبل کے لئے ایک پیغام بھی
 موجود ہے۔

اسی انجمن کے کسی اور جلسے میں اقبال نے چند قطعات پڑھے، جن
 میں سے دو ایک یہ ہیں :

سوتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور
 یا نافہ غزال ہوا ہے حتن سے دور
 عندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر
 بابل نے آشیالہ بنا یا چمن سے دور
 سو تدابیر کی لے قوم وہ ہے اک تدبیر
 چشم اغیار میں بڑھتی ہے اس سے توجیر
 در مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں
 بل کے دلیا میں رہو مثل حروف کشمیر

ان قطعات میں اقبال نے اپنے سوز و ساز سے قوم کے سامنے اجتماعی نظام کا
 ایک نقشہ پیش کیا ہے جس کے رنگ و آہنگ سے ان کا نور بصیرت
 جگمگا رہا ہے۔

م۔ اہل کشمیر سے محبت رکھنے کے باوجود اقبال ایک عرصہ تک کشمیر جنت

نظیر کو نہ دیکھ سکے؟ کیا یہ صحیح ہے؟

ج - جی ہاں! اقبال ۱۹۲۱ تک کشمیر نہ دیکھ سکے۔ اسی سال گرمیوں میں اس کے لئے خود بخود اسباب پیدا ہو گئے۔ ریاست جموں و کشمیر میں شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش ناسور تاجر اور رئیس تھے۔ زمانے کے انقلاب نے ان پر اپنا اثر ڈالا اور پنجاب لیژنل بینک کی شاخ سرینگر نے حساب کتاب اور لین دین کے معاملے میں ان کی ڈگریاں ”ترقیات“ کرا کے ہزارہا روپے کی جائیداد سینکڑوں میں نیلام کرادی۔ شیخ محمد بخش مرحوم کے داماد منشی سراج الدین نے جو اس وقت سہتم بندویست کے مثل خواں تھے اور بعد میں اپنی قابلیت سے ترقی کر کے خود افسر مال ہو گئے تھے، ڈاکٹر اقبال کی قانونی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو اس مقدمے میں کشمیر بلا یا۔ ڈاکٹر صاحب جون ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ سولوی احمد دین وکیل اور اپنے منشی طاہر الدین مرحوم کے ہمراہ کشمیر گئے اور قریباً دو ہفتے سرینگر میں رہے۔ ہاؤس بوٹ میں ان کا قیام تھا۔ مقدمے اے ڈی حکیم سیشن جج کی عدالت میں تھا۔ مگر چند ابتدائی غلطیوں کی وجہ سے اس مقدمے کا فیصلہ حسب منشا نہ ہو سکا، جس کا اقبال کو افسوس رہا۔

اقبال کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سرینگر میں اقبال کو ایک اور مقدمہ بھی ملا، یہ رحمان راہ کا تھا جو سرینگر کا باشندہ تھا اور قتل کے الزام میں ماخوذ تھا۔ اقبال کی بحث سے اتنا ہوا کہ وہ پھانسی پانے سے بچ گیا۔

قانونی کسوں سے فارغ ہونے کے بعد کشمیر کی سیر کا لطف بھی اٹھا یا گیا۔ چنانچہ ایک دن اقبال، منشی سراج الدین احمد، میر منشی ریڈیڈنسی کشمیر، سولوی احمد دین، سیٹھ کریم بخش، منشی نور الہی تحصیل دار،

صاحبزادہ محمد عمر اور چند دیگر علم دوست احباب شکارے (۱) میں بیٹھ کر ڈل کی سیر کو گئے۔ نشاط باغ اور شالانار میں کافی وقت گزار کر شام کو یہ قافلہ ادب واپس آیا۔ دونوں وقت سل رہے تھے کہ شکارا اس انجمن ادب کو لئے ڈل میں پہنچ گیا۔ اس وقت آفتاب غروب ہو رہا تھا، شفق بھوٹی ہوئی تھی اور اس منظر کا عکس ڈل کے شفاف پانی میں شور افشانی کر رہا تھا۔ اس کیف اور منظر نے عجیب کیفیت پیدا کر دی تھی، جس نے علامہ مدوح کے دل پر خاص اثر کیا۔ تھوڑی دیر صحیفہ قدرت کے اس سنہری ورق کا مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحر فکر میں غوطہ زن ہوئے اور دو در شہوار نکال لائے۔ نقاش فطرت کی قدرت دیکھئے! دو شعروں میں سارے منظر کی تصویر کھینچ دی ہے۔

تماشائے ڈل کن کہ ہنگام شام
دھد شعلہ را آتیاں زیر آب
بشوید زتن تا غبار سفر
زند غوطہ در آب ڈل آفتاب

جنت ارضی کے اس مختصر سے سفر میں اقبال نے کشمیر اور کشمیریوں کو جن معائب میں مبتلا دیکھا، اس کا اظہار آپ نے اپنی کئی نظموں میں مختلف پیرایوں سے کیا۔ پیام شرق میں اقبال کی تین نظمیں کشمیر، غنی کشمیری اور ساقی نامہ سلتی ہیں جن کے ذریعے سے حسن فطرت اور حقائق نمود حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کشمیر کے فارسی لٹریچر کی اقبال کے دل میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ سلا طاهر غنی کی شخصیت سے وہ اس درجہ متاثر تھے کہ ان کے استغناء کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے بعض اشعار پر تضمینیں بھی لکھیں۔ کشمیر کے متعلق کتابیں لکھنے والوں کی بھی اقبال ہر طرح حوصلہ افزائی

۱ کشمیری زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی 'ہلکی کشی' کے ہیں۔

فرماتے تھے۔ چند دوستوں کو خود بھی بعض عنوانات پر قلم اٹھا
پر ابھارتے رہتے تھے۔

کشمیر میں جس قدر صولیا ئے کرام تبلیغ اسلام کی خاطر آئے، ان میں حفصہ
امیر کبیر سید علی ہمدانی کو سب سے زیادہ شہرت اور کامیابی نصیب ہوئی
اقبال ان کی عظمت، بزرگی اور غیر معمولی شخصیت سے بہت متاثر تھے
انہوں نے جاوید نامہ میں ان کا ذکر بڑے پر خلوص الفاظ میں کیا
اقبال کو ان کی تصانیف دیکھنے کا کس قدر شوق تھا؟ اس کا اند
آپ کے ایک خط کی سندرچہ ذیل عبارت سے کیا جا سکتا ہے۔

”ذخیرۃ الملوک دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ سنا۔

نوئی شخص کشمیر میں اس کا ترجمہ اردو میں کر رہا ہے۔“

۱۹۳۱ء کی تحریک حریت کشمیر کے دنوں میں اقبال کشمیر کے حالا
کا بڑے غور سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ جو کہ
ہو رہا ہے، توقع کے خلاف نہیں۔ ممکن ہے کبھی اس سے بھی بڑا
انقلاب کشمیر میں آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اقبال ہی کی تحریک
سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم ہوئی جس نے دستوری اور آئینی ذرا
سے کشمیریوں کو جائز انسانی حقوق دلانے کی کوشش کی۔ اقا
ہی کی ساعی سے حکومت کشمیر نے گلاسی کمیشن مقرر کیا ج
نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ کشمیریوں کو مکمل مذہبی آزاد
دی جائے، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضہ ہٹا کر انہیں عو
کے سپرد کیا جائے۔ تعلیم کی اشاعت عام کی جائے، مسلم اساتذہ
تعداد بھی بڑھائی جائے اور دیگر ملازمتوں میں بھی ہر فرقہ کے لوگو
کو ان کے تناسب آبادی کے لحاظ سے حصہ دیا جائے۔ اقبال نے بھی
صدر مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی کشمیریوں کے مطالبات
حمایت کی۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ ایک عظیم المرتبت اور عالمگیر شہرت رکھنے والا شاعر اور فلسفی، جس کی تعلیم و وطنیت اور ذات ہات کی تمیز سے بالا تر تھی، ایک محدود خطہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور مظلومیت کی داستاںیں سن کر تڑپ اٹھا اور کہا:-

توڑ اس دست جفاکش کو یارب جس نے
روح آزادی کشمیر کو ہمال کیا

یا یہ کہ ظالموں سے باز پرس کرنے والی ہستی اپنی گرفت مضبوط کیوں نہیں کرتی اور قیامت کے دن کے لمحے نزدیک کیوں نہیں آتے۔

آہ! یہ قوم نجیب و چوب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز سگائات اے خدائے دیر گیر؟

در اصل وطن سے محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے پھر اقبال اس جذبے سے کیونکر خالی رہ سکتے تھے۔ اسی جذبے کے ماتحت ان کا دل ہندوستان اور کشمیر کی تباہی پر کڑھتا تھا اور وہ اپنے خیالات کے اظہار پر مجبور ہو جاتے تھے اور کبھی کبھی رزم سیاست کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر قوم کی رہبری اور راہنمائی کے لئے میدان کارزار میں کود پڑتے تھے۔